حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(بیسویں قسط)

کورنگی ٹاؤن شپ کی تعمیر

یہ زمانہ وہ تھا کہ جنرل محمد ایوب صاحب مرحوم کا مارشل لاء نیا نیا لگا تھا، اور انہوں نے بہت سے انقلابی کام شروع کئے ہوئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد مہاجرین کی مسلسل آمد کی وجہ سے ان کی آبادکاری کا مسئلہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ مہاجرین کی اکثریت جھونپڑیاں ڈال کر ان میں رہ رہی تھی، اور بہت سے لوگ فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ ان کی آبادکاری کے لئے جنرل محمد ایوب خان صاحب نے کورنگی ٹاؤن شپ کا منصوبہ شروع کیا، اور جنرل محمد اعظم خان صاحب مرحوم کو اس کی تکمیل کا فریضہ سونپا، چنانچہ انہوں نے انتہائی برق رفتاری سے کورنگی کے وسیع علاقے میں مکانات کی تعمیر شروع کی، جس کی نگرانی وہ بذات خود موقع پر آ کر کیا کرتے تھے، چنانچہ بہت مختصر عرصے میں چند سالوں میں دیکھتے ہی دیکھتے کورنگی روڈ سے لے کر ہمارے دارالعلوم کے سامنے تک ایک وسیع آبادی تیار ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں بھی رفتہ رفتہ شہری زندگی کی کچھ سہولیات حاصل ہوگئیں۔ پانی کی لائن کورنگی کالونی تک آئی تو ہمیں بھی اُس میں سے حصہ ملا، اور پائپ لائن دارالعلوم تک پہنچ گئی، جس کی وجہ سے شرافی گوٹھ سے پانی لانے کی زحمت باقی نہ رہی، اور دارالعلوم ہی میں ایک زیرزمین حوض تعمیر کر کے پانی کا ذخیرہ اُس میں جمع کیا جانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ بجلی کی لائن بھی ہم تک پہنچ گئی، اور لالٹینوں اور ہنڈوں کے بجائے اب ہم براہ راست بجلی سے فیض یاب ہونے لگے۔

ہمارا قیام بدستور اسی چھوٹے سے مکان میں رہا جو حاجی کبیرالدین صاحب مرحوم نے بنا کر دارالعلوم کو دیا تھا۔ حضرت مولانا خورشید عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر والوں کو دیوبند سے لے آئے تھے، اور ایک الگ مکان میں منتقل ہوگئے تھے۔ اس لئے اب اس مکان کے دونوں کمرے ہم تین آدمیوں کے تصرف میں تھے۔ میں، بھائی صاحب اور حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم۔ حکیم مشرف صاحب اگلے سال تعلیم سے فارغ ہوگئے، تو ہم اس گھر میں دو ہی رہ گئے۔ یہ گھر دارالعلوم کی دوسری عمارتوں سے الگ تھلگ تھا، اُس کے دائیں

طرف ایک کچی سڑک گذرتی تھی جس پر کبھی کبھی اونٹ گاڑیوں کی آواز آجایا کرتی تھی۔ اُس کے بعد جنگل ہی جنگل تھا، گھر کے سامنے مغرب میں دور تک ریتیلا صحرا پھیلا پڑا تھا، بس جنوب مغرب میں قریب ترین عمارت درس گاہوں کی تھی جو رات کو سنسان ہوجاتی تھی، چنانچہ جب رات کا اندھیرا گہرا ہوتا، تو پورے ماحول پر ایک مہیب سا سناٹا چھا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بھائی صاحب کی شادی ہوگئی تو انہیں بار بار لاہور جانا پڑتا، اور اس طرح بکثرت مجھے تنہائی اور سناٹے کے اس ماحول میں تنہا بھی رہنا پڑتا تھا۔

شہر سے تعلقات

پڑھنے کے زمانے سے پڑھانے کے دور تک ہمارا اکثر قیام دارالعلوم ہی میں رہا، لیکن چونکہ والدین اور دو بھائی ہمارے لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں مقیم تھے، اس لئے ہر جمعرات کو ہم گھر جایا کرتے تھے۔

میرا اس قسم کا کوئی باقاعدہ دوست نہیں تھا جیسے لڑکپن کے دور میں عام طور سے لوگوں کے بہت سے دوست بن جایا کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ کھیلوں اور تفریحات میں وقت گذرا کرتا ہے۔ لے دے کر حکیم مشرف حسین صاحب (مرحوم) تھے، جن کا میں پیچھے بار بار ذکر کر چکا ہوں، لیکن وہ بذات خود ایک باغ و بہار آدمی تھے جن کے بہت سے دوست تھے، اور ان کی چھٹی کے دن ان کے ساتھ گذرا کرتے تھے، اور میں چھٹی میں ان کی رفاقت سے محروم رہتا تھا۔ البتہ جناب محمد کلیم صاحب جن سے ہمارے برنس روڈ کے قیام کے زمانے میں دوستانہ تعلقات قائم ہوئے تھے، وہ کبھی کبھی جمعہ کے دن ہمارے یہاں آجایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، کلیم صاحب ان سے بیعت ہوگئے تھے، اور ان پر حضرتؒ کی تعلیمات کا ایک رنگ چڑھا ہوا تھا، چنانچہ وہ تشریف لاتے، تو اکثر حضرتؒ ہی کی باتیں کیا کرتے، اور میں ان سے خوب خوب استفادہ کیا کرتا۔

بعد میں کبھی کبھی حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم بھی جمعہ کو عصر کے بعد ہمارے یہاں آنے لگے، اور پھر کافی عرصہ یہ معمول رہا کہ عصر کے بعد ہم تینوں کہیں سیر کے لئے چلے جاتے۔ اس زمانے میں شہر میں ہجوم کا وہ عالم نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے، اس لئے ہماری سیر صدر کے علاقے میں کسی جگہ چائے پی کر فریئر ہال یا ایوان صدر تک ہوا کرتی، اور کبھی کبھار کلفٹن کے ساحل پر بھی چلے جاتے تھے۔

اس سے زیادہ دوستیوں کا کوئی سلسلہ میری لڑکپن کی زندگی میں نہیں تھا، بلکہ جب میں اپنے دوسرے ہم

عمروں کو دیکھتا، تو کبھی کبھی مجھے تنہائی کا بھی احساس ہوتا تھا۔

جمعرات کی شام سے جمعہ کی شام یا ہفتے کی صبح تک کا وقت شہر میں گذرتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گھر میں بڑا اچھا کتب خانہ رکھا ہوا تھا۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کم آمدنی کے باوجود مختلف جگہوں سے خرید خرید کر جمع کی تھیں، اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ تاریخ اور شعروادب، فلسفہ، اور سائنس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ مجھے چونکہ کتابوں کا شوق تھا، اس لئے جمعرات کو گھر پہنچنے اور گھر والوں سے ملنے کے بعد میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس کتب خانے سے رشتہ جوڑ لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پورے کتب خانے کا مطالعہ تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں ہر کتاب کو الٹ پلٹ کر اس کے نام، موضوع اور اُس کے مصنف کے بارے میں معلومات حاصل کرتا، اور فہرست پر نظر ڈال کر جس موضوع سے کچھ دلچسپی معلوم ہوتی، اُس کا مطالعہ بھی کر لیتا تھا۔ اس طرح میں نے الحمد للہ رفتہ رفتہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی الماریوں میں سے ایک ایک کتاب کا تعارف حاصل کر لیا تھا، اور مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کونسی کتاب کہاں رکھی ہے۔ چنانچہ جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھ سے منگواتے، اور میں تلاش کئے بغیر فوراً لے آیا کرتا تھا۔ اس طریقے سے مجھے اس کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ جب کسی مسئلے کی تحقیق کی ضرورت ہو تو مجھے کونسی کتابوں سے مدد مل سکتی ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس برصغیر کے اہم رسالے اور ہفتہ وار اخبارات کثرت سے آیا کرتے تھے، اور ہر ہفتے میں تازہ آئے ہوئے اخبارات اور رسالوں پر ایک نظر ضرور ڈالتا تھا، اور ان سے یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ برصغیر کے علمی حلقوں میں کونسے معاملات زیر بحث ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے چونکہ مطالعے اور ادب و انشاء کا شوق تھا، اس لئے میں اپنے پڑھنے کے زمانے ہی سے معاصر علماء اور اہل قلم کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اکابر علماء دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ؒ، مولانا ابوالکلام آزاد ؒ، مولانا شبلی نعمانی ؒ وغیرہ کی کتابوں سے میں مضامین سے زیادہ ادب و انشاء اور علمی باتوں کو عام فہم اور ادبی انداز میں بیان کرنے کا طریقہ خاص طور پر دیکھا کرتا تھا۔ دینی گھرانوں میں ناولوں کا مطالعہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن میں نے نسیم حجازی مرحوم کے تمام ناول بھی اس لئے پڑھے تھے کہ اگر عربی ادب سیکھنے کے لئے مقامات، متنبی اور سبعہ معلقہ پڑھے جا سکتے ہیں تو اردو ادب اور تاریخ کے لئے نسیم حجازی کے ناول ان سے بدرجہا غنیمت ہیں، اور ان سے ادب اردو کا ایک خاص ذوق حاصل ہوتا ہے، اور فی الجملہ دینی فکر کو بھی مدد ملتی ہے۔

اسی حوالے سے میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ کی متعدد کتابیں بھی ذوق وشوق سے پڑھی تھیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھے اپنے اساتذہ اور خاص طور پر حضرت والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت وتربیت حاصل تھی، اور فی الجملہ اسلامی علوم سے بھی کچھ نہ کچھ مناسبت پیدا ہوگئی تھی، اس لئے مولانا مودودیؒ کی کتابوں میں جو باتیں جمہور سے ہٹی ہوئی نظر آتیں، ان کا احساس بھی ہوجاتا تھا، اور ان سے اختلاف بھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علمی مضامین کی تفہیم کے لئے ان کا اسلوب بیان مجھے مذکورہ بالا تمام مصنفین سے کہیں زیادہ مؤثر اور بلیغ معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے مغربی افکار پر جس انداز سے تنقید کی ہے، وہ بھی مجھے بہت قابل تعریف معلوم ہوتی تھی، اور ساتھ ہی یہ حسرت بھی ہوتی تھی کہ کاش! مغرب کا اتنا مؤثر نقاد فقہی اور اعتقادی مسائل میں جمہور سے الگ راستہ اختیار نہ کرتا یا کم ازکم اپنے اجتہادات کی تائید میں دوسرے اہل علم کے خلاف جارحانہ اسلوب اختیار نہ کرتا، تو امت ایک بڑے انتشار سے بچ جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنی مغفرت سے نوازیں، انہوں نے جس تندی اور تیزی کا مظاہرہ مغربی افکار کے خلاف کیا، ادبیت کے جوش میں تقریباً اُتنی ہی تیزی روایتی علماء کے خلاف بھی استعمال کی، اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جو حضرات دین کے معاملے میں انہی کے لٹریچر پر اکتفاء کرتے ہیں، (اور کم ازکم اُس وقت جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے عام کارکنوں کی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی) ان کے دلوں میں یہ تصور شعوری یا غیر شعوری طور پر جاگزین ہوجاتا ہے کہ دین کی جو فہم مولانا مودودیؒ نے پیش کی ہے، وہ کسی اور نے پیش نہیں کی، اور روایتی علماء نے دین کی جامعیت کو سمجھنے کے بجائے بزرگوں کی تقلید کے تحت اپنے آپ کو چند مسائل کے خول میں بند کرکے امت کی صحیح رہنمائی میں کوتاہی کی ہے، اور خاص طور پر اسلام کے سیاسی پہلو میں ان کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے۔

بعض حضرات کے ذہن میں یہ تصور اس درجہ سما جاتا ہے کہ روایتی علماء اور طلبہ کے ساتھ ان کے رویے میں ان کی فی الجملہ تحقیر اور اپنی فکر پر غرور ادا ادا سے ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔ الحمد للہ بعد میں، خاص طور پر حضرت قاضی حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امارت کے دور میں، اس رویے میں کافی بہتری پیدا ہوئی ہے، لیکن اُس وقت صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں مشکوۃ یا دورۂ حدیث کی جماعت میں تھا تو اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک ٹیم دارالعلوم دیکھنے کیلئے آئی۔ اُس وقت میرے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں میں اپنے استاذ کی وہ تقریر لکھا

کرتا تھا جو وہ درس کے دوران ارشاد فرماتے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی وہ ٹیم مجھے راستے میں ملی، اور اُس کے سربراہ نے (جن سے بعد میں میرے کسی قدر دوستانہ مراسم بھی ہوگئے تھے، پھر وہ لندن چلے گئے تھے،) میرے سلام کا جواب دینے کے بعد قدرے ٹیڑھی گردن کے ساتھ میری اُس فائل کے بارے میں مجھ سے پوچھا: "مولوی صاحب! یہ آپ کیا لئے ہوئے ہیں؟" میں نے عرض کیا: "یہ میرے استاذ کی تقریر ہے جو میں درس کے دوران لکھا کرتا ہوں۔" انہوں نے چھوٹتے ہی ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: "اس میں علم غیب کے بارے میں گفتگو ہے؟" اس میں یہ واضح طنز پنہاں تھا کہ آپ لوگ تو مدرسوں میں اسی قسم کے فرقہ وارانہ مسائل میں الجھے رہتے ہیں، دین کے اصل کام سے (جو درحقیقت ہم کررہے ہیں) آپ کا کیا واسطہ؟

میں نے اُن کے اندازِ گفتگو کے پیش نظر ان سے زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا، اور ایک مختصر سا جواب دے کر آگے روانہ ہوگیا۔ لیکن اس قسم کے متعدد واقعات میرے سامنے تھے کہ مولانا مودودی صاحبؒ سے ہٹ کر انہیں ہر دینی کام فرقہ واریت، تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا مظہر نظر آتا تھا۔

لسبیلہ ہاؤس کا وہ علاقہ ہمارے وہاں آباد ہونے کے وقت نیا نیا آباد ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہاں کچھ مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ اس وقت انہی غریبوں نے ایک چھپر نما مسجد تعمیر کرلی تھی، اور اس کا نام "مسجد نعمان" رکھا تھا۔ اس کے امام صاحب بھی انہوں نے ہی منتخب کئے تھے جن کی قراءت ایسی تھی کہ ان کے پیچھے نماز کی صحت کا فیصلہ بڑے تأمل کے بعد ہی کیا گیا، اور بعض بدعات اس کے علاوہ تھیں، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ انفراداً نماز پڑھنے کے بجائے ان کے پیچھے پڑھنے کو گوارا فرمالیتے تھے۔ بعد میں انگلش بوٹ ہاؤس کے بانی جناب تاج صاحب مرحوم نے مسجد کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے کر مسجد کو باقاعدہ تعمیر فرمایا، تو اُس وقت اُن امام صاحب کی مناسب خدمت کرکے ان کے بجائے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کو امامت پر مقرر کیا، جو آج تک ماشاء اللہ خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

لیکن مسجد کے آس پاس تیزی سے پڑھے لکھے لوگوں کے مکانات کا اضافہ ہوتا رہا۔ وہاں ایک دوکان کے مالک جناب مسعود صاحب مرحوم جماعت اسلامی کے بڑے فعال کارکن تھے، اور انہوں نے محلے کے نوجوانوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کا کام پھیلانے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔

جب مسجد نعمان میں اسلامی جمعیت طلبہ کے میرے ہم عمر نوجوان مجھے ملتے، تو میں ان سے کنارہ کرنے کے بجائے اُن سے خندہ پیشانی سے ملتا، اور ان کے اچھے کاموں میں تعاون بھی کرتا۔ رفتہ رفتہ ان کے دلوں

میں یہ احساس پیدا ہوا کہ یہ شخص ہم سے کوئی اجنبیت نہیں رکھتا، چنانچہ ان میں سے کچھ ساتھی مجھ سے بے تکلف بھی ہوگئے، اور کبھی کبھی مجھ سے نماز روزے وغیرہ کے بارے میں کوئی مسئلہ بھی پوچھ لیتے تھے، لیکن اس انداز سے کہ "ہم آپ سے پوچھ تو رہے ہیں، لیکن آپ قرآن وحدیث سے اس کی دلیل بھی بتائیں، کیونکہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو بس مولوی صاحب کی بات پر بھروسہ کرکے کوئی بات مان جائیں۔ ہمیں قرآن وسنت سے سمجھائیں"۔ یہ بات جمعیت کے ایک ایسے ساتھی نے کہی جن کا میرے پاس بکثرت آنا جانا ہوگیا تھا، اور بے تکلفی بھی ہوگئی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ: "میرے بھائی! اگر میں آپ کے اس مطالبے پر کوئی آیت یا حدیث پڑھ دوں، تو کیا آپ سمجھ جائیں گے کہ اس آیت یا حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اور اُس سے وہ مسئلہ نکل رہا ہے یا نہیں؟" کہنے لگے: "نہیں، مگر آپ اس کا ترجمہ بھی تو بتائیں، اس سے ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ دلیل صحیح ہے یا غلط؟" میں نے کہا کہ: "یہ آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں نے ترجمہ صحیح کیا ہے یا نہیں؟" کہنے لگے کہ "یہ ہم جانتے ہیں کہ آپ ترجمہ غلط نہیں کریں گے" میں نے کہا کہ "ایک ہی عبارت کے بعض مرتبہ کئی ترجمے صحیح ہوسکتے ہیں، آپ کو کیا پتہ کہ میں نے کون سا ترجمہ کیا ہے؟ اور اگر بالفرض ترجمہ صحیح بھی ہو، تو آپ کے پاس یہ پتہ لگانے کا کیا راستہ ہے کہ اس آیت یا حدیث کے مخالف کوئی اور آیت یا حدیث ہے یا نہیں؟" اس پر وہ خاموش ہوگئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے مطالبات دھیمے پڑگئے، اور پھر رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں تبدیلی بھی آئی۔

ایک طرف مجھے ان کے اس ذہن کا اندازہ تھا، لیکن دوسری طرف اُس وقت ملک میں نفاذ اسلام کے لئے کوئی اور مؤثر تحریک سامنے نہیں تھی، اس لئے ان کی جو کوشش امت کے اجماعی مسائل کے لئے ہورہی تھی، اُس میں ان کی تائید وحمایت بھی مناسب معلوم ہوتی تھی، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جملہ بکثرت ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

"إن هم احسنوا فأحسن معهم، وإن أساؤوا، فاجتنب إساءتهم"

یعنی: "جب وہ کوئی اچھا کام کریں، تو تم بھی ان کے ساتھ اچھا کام کرو، اور جب وہ کوئی برائی کریں تو ان کی برائی سے اجتناب کرو"۔

اس لئے میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھے، اور کبھی کبھی ان کے اجتماعات میں ان کی فرمائش پر خطاب بھی کیا۔ اُسی زمانے میں جناب منور حسن صاحب، جو بعد میں جماعت

اسلامی کے امیر بھی رہے، اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن تھے، ان اجتماعات میں ان کا بھی کئی مرتبہ ساتھ رہا۔ جمعیت کے کارکنوں میں مجھے بہت سی خوبیاں بھی نظر آئیں، ان میں سے بہت سے نوجوان مجھے اپنے جذبے اور جدوجہد میں قابل رشک بھی محسوس ہوئے، اور میں ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا بھی معترف رہا، البتہ ان کی جس فکر کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، موقع بہ موقع اس کے بارے میں اپنی گذارشات بھی پیش کرتا رہا جن کا الحمدللہ اثر بھی ظاہر ہوا۔ پھر میری اپنی مصروفیات خود اتنی بڑھ گئیں کہ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

نحو وصرف کی تدریس

تدریس کے ابتدائی سالوں میں عربی نحو وصرف کی تمام کتابیں نحو میر سے لے کر شرح جامی تک پڑھانے کی نوبت آئی، لیکن مجھے نحو وصرف کو فلسفہ بنا کر پڑھانے سے کبھی مناسبت نہیں ہوئی۔ اس لئے کافیہ اور شرح جامی میں تحریر سنبٹ، سوال کابلی، اور سوال باسولی وغیرہ کی بنیاد پر جو چون وچرا کی جاتی ہے، (بلکہ اب تو یہ چون وچرا ہدایۃ النحو ہی سے شروع ہونے لگی ہے) میں اُس سے گذرا ضرور، لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہی، اور طلبہ کو بھی سمجھائی کہ نحو وصرف کا اصل مدار کلام عرب کے سماع پر ہے، اور اُسے عقلی اور منطقی دلائل کے تابع قرار دینا ایسا نکتہ بعد الوقوع ہے جس میں الجھ کر نحو وصرف کا جو اصل مقصد ہے، (یعنی تحریر وتقریر کی درستی) وہ فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ عام طور پر اس کی تاویل یوں کر لی جاتی ہے کہ اس سے طلبہ کا ذہن کھلتا ہے، اور انہیں نکتہ رسی کی عادت پڑتی ہے، جسے مدارس کی اصطلاح میں "تشحیذ الاذہان" (ذہن تیز کرنا) کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ بات اُس وقت تو فی الجملہ درست ہوتی، جب نحو وصرف کے قواعد کو استعمال کرنے کی صلاحیت طلبہ میں پوری طرح پیدا ہوگئی ہوتی، اور طلبہ صحیح پڑھنے، صحیح لکھنے، اور صحیح بولنے پر پوری طرح قادر ہو چکے ہوتے، پھر ایک اضافی فائدے کے طور پر یہ مقصد بھی حاصل کر لیا جاتا، چنانچہ شاید ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ طلبہ کو ابھی عربی عبارت صحیح پڑھنے پر بھی قدرت نہیں ہوئی ہوتی، چہ جائیکہ وہ صحیح بول اور لکھ سکیں، اور شروع ہی میں انہیں ان بحثوں میں الجھا دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ نحو وصرف کا اصل فائدہ حاصل نہیں کر پاتے۔

لیکن مدارس میں "کافیہ" وغیرہ پڑھانے کا جو طریقہ عرصے سے جاری تھا، طلبہ بھی اُس کے عادی تھے، اور کسی استاذ کے لئے اُس طریقے سے انحراف اپنے آپ کو طلبہ میں غیر مقبول بنانے کے لئے کافی تھا۔ اگر استاذ خود سے وہ بحثیں نہ چھیڑے، تو کوئی نہ کوئی طالب علم اُن سے متعلق کوئی سوال کر دیتا تھا۔ اس کا

پیشکش:ابومعاذ راشد حسین

حل میں نے اس طرح کیا کہ "کافیہ "پڑھاتے ہوئے میں نے شروع کے چند دن اُسی معمول کے طریقے کو اختیار کیا۔ لیکن پھر طلبہ کو بتایا کہ اس کے کیا نقصانات ہیں؟ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی کتابوں میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب " الاقتراح فی اصول النحو " مجھے ہاتھ لگ گئی تھی۔ میں نے اُس کی مدد سے نحو کی اصل بنیادیں طلبہ کے سامنے بیان کیں، اور اُس کے بعد جب کوئی طالب علم چون وچرا پر اصرار کرتا، میں اُس سے عبارت پڑھوالیتا جس میں وہ لازماً غلطی کرتا، اور اس طرح اُس پر یہ واضح ہوجاتا کہ وہ اس چون وچرا کے چکر میں نحو کی غرض وغایت (یعنی الاحتراز عن الخطأ اللفظی فی الکلام) سے کتنی دور چلا گیا ہے۔ اور اُس کے بعد میں نے اپنے طریقے سے ساری کتاب پڑھائی۔

جاری ہے.....